

فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ (القرآن)

مَحَلَّةٌ

السنة

مدير: د. عبد الرحمن بدوي

مَجَلَّةُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ

فتی اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ مُحَدِّث لاہور

جلد نمبر ۲۲ جمادی الاولیٰ / نومبر ۱۹۹۳ء عدد نمبر ۶

اس شمارے میں

حافظ صلاح الدین یوسف

(حصہ اول)

کیا اجتہاد صرف منتخب نمائندوں ہی کا حق ہے؟
بیسلسلہ جدید اسلامی ریاست میں تعبیر شریعت کا اختیار
بحوالہ ماہنامہ "مطلوع اسلام" لاہور اکتوبر ۱۹۹۳ء



حافظ عبد الرحمن مدنی
مولانا سعید مجتبیٰ سعیدی
مولانا محمد رمضان سلمی
مولانا عبد الرحمن کیفی
حافظ حسن مدنی

بیکل اشتراکے

زیر سالانہ - 10 روپے

فی پرچہ - 100 روپے

دفتر راجستہ

۹۹-بی، نول ٹاؤن، لاہور

فون: ۸۵۲۸۹۷

حافظ عبد الرحمن مدنی نے زاہد بشیر پرنٹرز

رینی کن روڈ لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حافظ صلاح الدین یوسف

فکر و نظر

کیا اجتہاد صرف منتخب نمائندوں ہی کا حق ہے؟

بلسلسلہ اسلامی ریاست میں تعبیرِ شریعت کا اختیار

آج کل بہت سے سیکولر اہلِ قلم، جن میں علامہ اقبالؒ کے فرزند جاوید اقبال بھی شامل ہیں، فکرِ اقبال کے حوالے سے ایک شرعی اصطلاح - اجتہاد - کے بارے میں ایسی باتیں کہہ اور پھیلا رہے ہیں کہ جن سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ گمراہی اور صراطِ مستقیم سے انحراف پر مبنی ہیں۔

علامہ اقبالؒ بلاشبہ ایک قومی نہیں، ملی شاعر ہیں اور ملکی نہیں، آفاقی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبہ و عمل کی جو توانائی ہے، اقدام اور ولولے کی جو فراوانی ہے اور دلوں کو حرارتِ ایمانی سے بھر دینے والی جو خوش نواکی ہے، اس نے یقیناً ان کو انفرادیت کا ایسا مقام عطا کیا ہے، جس میں کوئی بھی شاعر ان کا شریک و ہم سیم نہیں اور نہ بظاہر آئندہ اس کا کوئی امکان ہی نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ملتِ اسلامیہ کے ایک عظیم محسن اور تاریخِ اسلام کی ایک نہایت تاب ناک شخصیت ہیں اور ان کا کلام ہمارا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے جس سے جلد قوتوں کو حرکت و عمل کا درس ملتا رہے گا، بے جان جذبوں کو توانائی ملتی رہے گی اور جو روح کو تڑپ اور دلوں کو حرارت بخشتا رہے گا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعہ

علامہ کی عظمت کے لئے ان کی جذبوں اور ولولوں سے بھرپور اور ایمان و عمل سے سرشار شاعری ہی کافی ہے۔ بنا بریں راقم ان لوگوں سے، جو ان کے بعض افکار سے یا ان کے شاعرانہ کلام سے ان کو ایک عظیم فکری رہنما بھی پاور کرانا ان کی عظمت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، اتفاق نہیں کرتا۔ کیونکہ علامہ اقبالؒ ایک نابغہ عصر شاعر تو ضرور تھے لیکن مسئلہ اسلامی مفکر انہیں مشکل ہی سے قرار دیا جاسکتا ہے اور اب تو اس سے بھی بڑھ

کر انہیں "امام معصوم" بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ اہل قلم کے بیانات و مقالات سے حشر ہے۔ یہ حضرات علامہ اقبال کے وہ خیالات جن سے ان میں مضمر خطرات کی بناء پر اہل علم و فکر نے خاص اثناء نہیں کیا، انہیں نہ صرف نہایت بلند آہنگی سے پیش کر رہے ہیں بلکہ ان کے خیال میں علامہ اقبال کے زیر بحث انکار سے بے وفائی ہی کا نتیجہ ہے کہ

"قدرت نے اس قوم کو فرقہ واریت، صوبائیت، لسانییت، علاقائیت، غربت، جہالت اور

بیماری کے دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا" _____ (روزنامہ نوائے وقت، 18 نومبر 1986ء

مضمون ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ و طلوع اسلام، لاہور۔ اکتوبر 1992ء) حالانکہ یہ نتیجہ ان انکار اقبال سے روگردانی و بے وفائی کا نہیں ہے جو جناب ڈاکٹر گورایہ صاحب نے پیش فرمائے ہیں بلکہ یہ نتیجہ تو اسلام سے بے وفائی اور غداری کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطبات میں پیش کردہ فکر اقبال ان حضرات کے نزدیک اسلام کے ہم معنی یا اس کی کامل تعبیر ہے۔ ورنہ شاید اس سے بے اعتنائی پر ڈاکٹر گورایہ صاحب وہ تبصرہ نہ فرماتے جو مذکورہ بالا اقتباس میں گزرا ہے۔ خیال رہے کہ گورایہ صاحب کا یہ مضمون چھ سال قبل "نوائے وقت" اور "جنگ" میں بھی شائع ہوا تھا اور اب ماضی قریب میں "طلوع اسلام" میں شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر گورایہ صاحب کے اس مقالے میں فکر اقبال کے حوالے سے جو باتیں کہی گئی ہیں ذیل میں ان کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اصل موضوع پر گفتگو ہو، تمہیداً یہ بات سامنے رہنی چاہئے کہ علامہ کے انکار اور کلام میں اسلام سے والہانہ وابستگی اور اسلامی تہذیب و تمدن کے برتر و بہتر ہونے کا تصور تو قدم قدم پر ملتا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں اسلامی نظام و تہذیب کی صورت گری اور عملی تکمیل کس طرح ہو؟ اس سلسلے میں علامہ کے کلام و انکار سے واضح انداز میں رہنمائی نہیں ملتی بلکہ ایک گونہ تضاد سامعوس ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ انہیں اشتراکیت کا ہمنوا ثابت کرتے ہیں تو دوسرے اس کے مخالف۔ کچھ انہیں تصوف کا رمز آشنا باور کراتے ہیں تو کچھ اس کو پے سے ٹالہ۔ ایک طبقہ انہیں "ملاہیت" کا دشمن قرار دیتا ہے تو دوسرے انہیں علماء کا کش بردار اور خادم۔ کوئی انہیں مشہی جمہوریت کا علم بردار ثابت کرتا ہے تو دوسرا اس سے متنفر اور گریزاں۔ حتیٰ کہ بعض لوگ انکارِ حدیث تک کا احتساب ان کی طرف بڑے فخر سے کرتے ہیں جب کہ دوسرے انہیں سچا عاشقِ رسول اور سنتِ رسول کا شیدائی سمجھتے ہیں۔ راقم کے نزدیک وہ بچے مسلمان تھے اور اشتراکیت کی ہمنوائی کے الزام سے انہوں نے خود ہی اپنی زندگی میں برائت کا اظہار کر دیا تھا۔ جن مغرب زدہ افراد نے علمائے اسلام کو بدنام کرنے کے لئے "ملاہیت" کی اصطلاح گھڑی ہے، علامہ کا دامن ان کی ہمنوائی سے بھی

ہاک ہے، وہ علمائے حق سے خصوصی تعلق خاطر اور ان کے بارے میں احترام و عقیدت کے جذبات رکھتے تھے اور انہیں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے جس طرح عشق تھا، اسی طرح سنت رسول کو بھی وہ دین کا ماخذ اور قرآن کریم کی طرح حجت تسلیم کرتے تھے۔

لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یاران سربل نے اس کے برعکس خیالات ان کی طرف کیوں منسوب کر دیئے ہیں؟ اس کی وجہ راقم کے نزدیک وہی ہے جو ابھی اوپر عرض کی گئی ہے کہ ان کے کلام میں مربوط فکری راہنمائی کا فقدان ہے۔ نہ وہ اس میدان کے آدمی تھے نہ انہوں نے ایک متعین فکر ہی دیا ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف احساسات و تصورات کے تحت انہوں نے مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے جس طرح کہ بالعموم شعراء کرتے ہیں۔ انہیں ان کے کلام اور شخصیت کے مجموعی تناظر میں دیکھا جائے تو ان کی تردید یا توجیہ و تطبیق زیادہ مشکل بات نہیں۔ لیکن مفاہ پرستوں نے اپنے اپنے مفاد کے لئے ان کے مجموعی کلام کو نظر انداز کر کے جس طرح ان کے ایک ایک مصرعے، ایک ایک شعر یا ایک ایک بند کو اپنے پورے پورے مجموعی نقطہ نظر پر چسپاں کیا ہے، وہ بددیانتی کا بھی شاہکار ہے اور علامہ اقبال کی شخصیت اور افکار پر بھی ایک بہت بڑا ظلم، جس کی وجہ سے وہ ایک ہیستیا بن کر رہ گئے ہیں۔ جو اقبال، جذبہ و توانائی کا سرچشمہ تھا، حرکت و عمل کا پیامبر تھا، اسلام کا شیدائی تھا اور اسلامی نظام و تہذیب ہی کو ملت اسلامیہ کے تحفظ و بقا کی ضمانت سمجھتا تھا۔ وہی اقبال نعوذ باللہ بعض لوگوں کے نزدیک اشتراکی تھا، بعض کے نزدیک منکر سنت تھا اور بعض کے نزدیک علمائے اسلام کا دشمن اور اب یہ آواز اور اٹھی ہے کہ علامہ اسلامی ملکوں کے لئے نظام سیاست اگر کوئی پسند کرتے تھے اور اسی میں ان کی نجات اور ترقی سمجھتے تھے تو وہ صرف اور صرف مغربی جمہوریت اور مغربی طرز حکومت ہے۔ ع

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا

اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

دوسری بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ مذکورہ اہل فہم علامہ اقبال کی جس کتاب کو بنیاد بناتے ہیں، اس میں بہت سی باتیں ان کے عمر بھر کے مجموعی کلام و نظریات کے بالکل مخالف ہیں۔ جس کی وجہ سے علامہ سید سلیمان ندوی جیسے شخص بھی، جو علامہ کے نہایت قدردان اور مزاج شناس تھے اور علامہ بھی ان کا نہ صرف نہایت درجہ احترام کرتے تھے اور دینی و

علمی مسائل و معاملات میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے بلکہ علامہ نے انہیں ”علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرماؤ“ (اقبال - سید سلیمان ندوی کی نظر میں - ص 23 طبع بریم اقبال، لاہور) بھی قرار دیا۔ علامہ کی اس کتاب کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوئے ہوتے تو اچھا تھا۔ جیسا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے روائعِ اقبال کے اردو ترجمہ ”نقوشِ اقبال“ کے مقدمے میں لکھا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”میں اقبال کو کوئی معصوم و مقدس ہستی اور کوئی دینی پیٹرو اور امام مجتہد نہیں سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حدِ افراط کو پہنچا ہوا ہوں جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکیم سنائی، عطار اور عارفِ ہدیٰ آدابِ شریعت کے پاس اور لحاظ اور ظاہر و باطن کی یک رنگی اور دعوت و عمل کی ہم آہنگی میں ان سے بہت آگے ہیں۔ اقبال کے یہاں اسلامی عقیدہ و فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ میں بعض پرجوش نوجوانوں کی طرح اس کا بھی قائل نہیں کہ اسلام کو ان سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم و حقائق تک ان کے سوا کوئی پہنچا ہی نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر دور میں اس کا قائل رہا کہ وہ اسلامیات کے ایک مخلص طالبِ علم رہے اور اپنے مقتدر معاصرین سے برابر استفادہ ہی کرتے رہے (مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی کے نام خطوط سے ان کے اخلاق و تواضع اور علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔)

ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم و فن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے اور جنہیں دور کرنے کا موقع انہیں نہیں ملا۔ (ان کے مدراس کے خطبات میں جو انگریزی میں ”Reconstruction of Islamic Thought“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور ان کا اردو اور عربی میں ترجمہ بھی ہوا ہے، بہت سے ایسے خیالات و افکار ملتے ہیں جن کی تاویل و توجیہ اور اہل سنت کے اجماعی عقائد سے مطابقت مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ یہی احساسِ استاذِ محترم مولانا سید سلیمان ندوی کا تھا۔ ان کی تمنا تھی کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوئے ہوتے تو اچھا تھا۔“

(”نقوشِ اقبال“ ص 39-40، مطبوعہ مجلس نشریات اسلام - کراچی)

تیسری بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے یہ ”خطبات“ ایک ایسا چیلن ہیں جسے کوئی اور تو کیا، خود ”خطبات“ کے شارحین بھی مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر رہے ہیں، جس کا اعتراف خود ایک ماہر اقبالیات ڈاکٹر وحید عشرت نے کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے خلیفہ عبدالحکیم کی ”فکر اقبال“ محمد شریف بٹاکی ”خطبات اقبال پر ایک نظر“ اور اسی نام سے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی کتاب، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی مرتبہ کتاب ”خطبات اقبال“ اور پروفیسر محمد عثمان کی کتاب ”فکر اسلامی کی تشکیل نو“ ان تمام کتابوں کا جائزہ لے کر سب کو ناقص، ناقص اور ناقص قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو مجلہ شش ماہی ”اقبالیات“

اقبال نمبر، جنوری تا جون 1986ء-ص 177-185 مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان

جب ”خطبات“ کا ماہرین اقبالیات کے نزدیک بھی یہ مقام ہے کہ وہ ابھی تک ایک معرہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، کی حیثیت رکھتے ہیں، تو ایسی کتاب کو بنیاد بنا کر اس میں پیش کردہ مبہم اور غیر واضح باتوں کو صحیفہ آسمانی کی طرح پیش کرنا کیوں کر صحیح ہے؟ جیسا کہ گورایہ صاحب اور ان جیسے بعض ”ڈانشور“ کر رہے ہیں۔ ان تین بنیادی تنقیدات کے بعد اب ہم مقالہ مذکور پر اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔ پورے مقالے کا خلاصہ حسب ذیل سات باتیں ہیں۔

- 1- ترکی کا اجتہاد، جس میں خلافت ایک منتخب اسمبلی کو تفویض کرنے کا نظریہ پیش کیا گیا ہے، روح اسلام کے عین مطابق ہے۔
- 2- جمہوری طرز حکومت روح اسلام کے عین مطابق ہے۔
- 3- قانون سازی کا صحیح اور جائز حق صرف منتخب اسمبلی کو ہے حتیٰ کہ تعبیر شریعت کا بھی کلی اختیار منتخب نمائندگی کو ہے، کسی نامزد ادارے یا نامزد علماء کو نہیں ہے۔
- 4- اجتہاد کا دروازہ بند ہونا محض ایک انسانہ ہے۔
- 5- انفرادی اجتہاد صحیح نہیں، عمد حاضر میں اجتہاد و تعبیر نو قانون ساز اسمبلی کا اختیار ہے۔
- 6- قومی اسمبلی کو فقہی مسالک سے بالا ہونا چاہئے اور کسی بھی فقہی مسلک کی بالا دستی اس پر نہیں ہونی چاہئے۔
- 7- کسی امر قانونی کے بارے میں صحابہ کا اجماع حجت نہیں۔

اب ہم ترتیب وار ان پر بحث کریں گے۔

(1) ترکی "اجتہاد" کی حقیقت : سب سے پہلے ترکی کے اس اجتہاد کی نوعیت و حقیقت واضح ہونی چاہئے جسے روح اسلام کے عین مطابق قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ وہی اجتہاد ہے جس کی رو سے خلافت کا خاتمہ کر کے مغربی جمہوریت کو نافذ کیا گیا اور سٹیٹ کو سیکولر (نافذہی ریاست) قرار دیا گیا، انگریزی ہیٹ کو لازم کر دیا گیا، دینی تعلیم حتیٰ کہ عربی میں اذان تک ممنوع قرار پائی، پردے کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا، عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف (رسم الخط) جاری ہوئے، مخلوط تعلیم کا نفاذ ہوا اور شرعی اداروں اور محکموں اور اسلامی قانون شریعت کو ملک سے بے دخل کر کے سوئٹزر لینڈ کا قانون دیوانی، اٹلی کا قانون فوجداری اور جرمنی کا قانون بین الاقوامی تجارت نافذ کیا گیا اور پرسنل لاء کو یورپ کے قانون دیوانی کے مطابق و ماتحت کر دیا۔ فرض مصطفیٰ کمال کے انگریزی سوانح نگار (H.C.ARMSTRONG) کے بقول

"ترکی قوم اور حکومت کی دینی اساس کو توڑ پھوڑ کر ختم کر دیا اور قوم کا نقطہ نظری بدل دیا" (Grey Wolf - P.190۔ بحوالہ "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" ص 64، طبع لکھنؤ)

ریاست کو نافذہی (سیکولر) بنانے کا بل پیش کرتے ہوئے مصطفیٰ کمال نے پارلیمنٹ میں جو تقریر کی، اس کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے عرفان اور گالکتا ہے۔

"اس بنیاد پر خاموشی اور خوبصورتی کے ساتھ عمل کرتے ہوئے مصطفیٰ کمال نے 3 مارچ 1924ء کو ایک بل پیش کیا۔ اس بل نے ترکی کی ریاست کو نافذہی شکل (Secular) دے دی اور خلیفہ کے منصب کو ختم کر دیا۔ بل کو پیش کرتے ہوئے مصطفیٰ کمال نے اس موضوع پر کھل کر بحث کی۔ اس نے کہا کہ عثمانی سلطنت، اسلام کے اصول پر قائم ہوئی تھی، اسلام اپنی ساخت اور اپنے تصورات کے لحاظ سے عرب ہے، وہ پیدائش سے لے کر موت تک اپنے پیروؤں کی زندگی تشکیل کرتا ہے اور ان کو اپنے مخصوص سانچے میں ڈھالتا ہے، وہ ان کی امنگوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے اور ان کی جرأت و اقدام پسندی میں روزے اٹکاتا ہے۔ ریاست کو اسلام کے مسلسل باقی رہنے سے خطرہ لاحق رہے گا۔"

نئے فیصلوں اور ان اصلاحات کا اسلام کے مستقبل پر جو اثر پڑا اور ان سے جو دور رس تبدیلیاں واقع ہوئیں، ان کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”پارلیمنٹ نے جو فیصلے کئے اور جن کا بہت کم نوٹس لیا گیا، حقیقت میں وہ اسلام کے حق میں کاری ضرب اور پیام موت کی حیثیت رکھتے تھے، تعلیم کی وحدت کا قانون نظامِ تعلیم میں دور رس تبدیلیوں کا باعث بنا، تمام تعلیمی نظم و نسق جو اس جمہوریئے کے حدود کے اندر پایا جاتا تھا وزارتِ تعلیم کے قبضہ و اقتدار میں آ گیا۔ اس تبدیلی نے مدرسوں کی سرگرمیوں اور ان علماء و اساتذہ کی آزادی کو ختم کر دیا جو ان میں تعلیم دیتے تھے۔ دوسرا قدم امور مذہبی کے محکمے کا قیام تھا جو ایک ڈائریکٹر کے ماتحت تھا اور جو شریعت اور اوقاف کی قدیم وزارت کی قائم مقامی کرتا تھا، اس وزارت کا کام مذہبی یا خیراتی مقاصد کی تکمیل اور مسجد اور یتیم خانے کی دیکھ بھال تھا۔ لیکن اس کے نظام اور طریقہ کار کا نہایت غلط اور شرمناک استعمال ہوتا تھا۔“ (بحوالہ اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص 65-66)

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

”تعماری رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط کے اجراء نے ترکی قوم کی زندگی میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا اور ایک ایسی نئی نسل کو جنم دیا جس کا رشتہ اپنی قدیم تہذیب و ثقافت سے کٹ چکا ہے۔ قدیم تہذیب و ثقافت اور علم و ادب پر اس کا جو انقلاب انگیز اثر پڑا ہے، اس کو ہمارے زمانے کے مقبول مغربی مورخ و مفکر آرنلڈ ٹائسن بی (Arnold Toynbee) نے اپنی کتاب (A STUDY OF HISTORY) میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے

”ایک قدیم روایت کے مطابق اسکندریہ کی لائبریری کا کل ذخیرہ جو نو سو سال سے زائد کی محنت کا نتیجہ تھا، پبلک حماموں کو گرم کرنے کے لئے ایدھن کے کام میں لے آیا گیا۔ ہمارے زمانے میں کتابوں کے جلا ڈالنے کے سلسلے میں ہٹلر نے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتا تھا، اگرچہ چھاپہ خانوں کے قیام کے باعث آج کل کے ظالم حکمرانوں کے لئے، جو اس سمت قدم اٹھائیں، نتائج کے اعتبار سے مکمل کامیابی حاصل کر لیتا بہت زیادہ دشوار ہو گیا ہے۔

ہٹلر کے ہم عصر مصطفیٰ کمال آتاترک نے ایک زیادہ موزوں طریقہ اختیار کیا، ترکی ڈکٹیٹر کا مقصد اپنے ہم وطنوں کے ذہن کو ایرانی تمدنی ماحول سے رہا کر کے، جو ان کو دورے میں ملا تھا، زبردستی مغربی تمدن کے سانچے میں ڈھالنا تھا اور انہوں نے کتابیں سوخت کرنے کے بجائے حروفِ نجی کو بدل ڈالنے پر قناعت کر لی۔

اس قانون کے نفاذ کے بعد ترکی غازی کے لئے چینی شہنشاہ یا عرب خلیفہ کی نقل کرنا غیر ضروری ہو گیا تھا۔ فارسی، عربی اور ترکی لٹریچر کے کلاسیکی ذخائر اب نئی نسلوں کی دسترس سے باہر ہو گئے تھے، اب کتابوں کے جلائے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی، کیونکہ وہ حروفِ محییٰ جو کہ ان کی کتب کی حیثیت رکھتے تھے وہی منسوخ کر دیئے گئے تھے، اب یہ ذخائر اطمینان کے ساتھ الماریوں میں بند پڑے رہ سکتے تھے۔ علاوہ چند سن رسیدہ علماء کے ان کو ہاتھ لگانے والا اب کوئی نہ تھا۔

(A Study of History - P.518-519) - اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔

ص 66-67

یہ قمار وہ ترکی "اجتہاد" جس کے نتیجے میں نہ صرف خلافت کا وہ ادارہ ختم ہو گیا جو چودہ و سال سے مسلمانوں کی مرکزیت کی علامت اور عالم اسلام کے تحفظ و بقا کی ضمانت تھا، بلکہ ترکی قوم اپنی اسلامی اقدار و روایات سے بھی بیگانہ ہو گئی۔

کما جا رہا ہے کہ ترکی کا یہ اجتہاد روح اسلام کے عین مطابق تھا اور اب ہمیں بھی اسی کی پیروی کرنی چاہئے۔ **إِنَّا لِلّٰهِ وَأِنَّا إِلَيْهِ رَاٰجِعُونَ** حالانکہ یہ مصطفیٰ کمال کی سراسر مغرب زدگی کا نتیجہ تھا جس پر خود علامہ اقبال نے بھی جاوید نامہ (ص 72) میں حسب ذیل تنقید فرمائی تھی۔

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود	گفت نقش کہنہ را با یزد دود
نوگرد کعبہ را رخت حیات	گرزا فرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگ لودر چنگ نیست	تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست
سینہ اور اوے دیگر نبود	در ضمیرش عالیے دیگر نبود
لاجرم باعالم موجود ساخت	خس موم از سوز این عالم گداخت

علاوہ ازیں علامہ نے اس مغربی تہذیب اور اس کے دل دادگان پر بھی بڑی زور دار تنقیدیں کی ہیں جس سے اہل علم باخبر ہیں جو ترکی اجتہاد کے نتیجے میں ترکی کا مقدر بنی۔

"اجتہاد" یا اسلام سے بغاوت و انحراف؟ : زیر بحث ترکی "اجتہاد" کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے کہ کیا اسے فی الواقع "ترکی اجتہاد" کہا بھی جا سکتا ہے؟ کیا اس "اجتہاد" میں ترکی کے سب یا قابل ذکر نمایاں اہل علم و فکر شامل تھے یا یہ صرف مصطفیٰ کمال اور اس کے چند رفقاء کی مطلق العنانیت اور جبر و استبداد کا نتیجہ تھا؟

حضرت علامہ تو اب اس دنیا میں موجود نہیں، لیکن ان کی ایک غیر واضح بات کو بنیاد بنا کر اس پر ایک پورے فلسفے اور نظریے کی عمارت کھڑی کرنے والے دانش وروں سے ہم ضرور یہ استفادہ کریں گے کہ ترکی کے اس ”اجتہاد“ کی نوعیت واضح کریں کہ مذکورہ ”اجتہادات“ مصطفیٰ کمال کی ذاتی خواہشات کا نتیجہ تھے یا وہ پوری ترکی قوم کی سوچ کے عکاس تھے؟ اگر اس میں پوری قوم یا اس کے نمائندے شامل تھے تو کس طرح؟ ان اجتہادی مباحث میں کس نے کیا حصہ لیا؟ کس طرح سوچ بچار ہوا؟ کون کون سے زاویے بحث و نظر کی گرفت میں آئے؟ اور پھر کس طرح پوری قوم یا اس کے نمائندگان ایک رائے یا ”اجتہاد“ پر متفق ہوئے؟ نیز پوری قوم اس ”اجتہاد“ میں اس کی ہمنوا تھی تو پھر اس اجتہاد کے نفاذ میں اسے جبر و استبداد کا سارا کیوں لینا پڑا؟ اس نے دام گیر کا بازار کیوں گرم کیا؟

ان تمام سوالات کی وضاحت ضروری ہے کیونکہ راقم کے علم کے مطابق یہ ”ترکی اجتہاد“ ہی نہیں تھا۔ یہ صرف ایک مطلق العنان حکمران کی اسلام سے بیزاری اور مغربی تہذیب پر فریفتگی کا شاخسانہ تھا اور ترکی میں جو کچھ ہوا ہے وہ ترکی قوم کی خواہشات کے علی الرغم ہوا ہے، سگینوں کے سائے میں ہوا ہے، جبر و تشدد کے ذریعے سے ہوا ہے اور زبانوں پر پورے بٹھا دینے اور ضمیروں پر قفل چڑھا دینے کے بعد ہوا ہے۔ جس شخص نے بھی اس دور کی کچھ تاریخ پڑھی ہے یا اس دور کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والوں کے مشاہدات سنے ہیں وہ یقیناً اس کا اعتراف کریں گے۔ ہو سکتا ہے بہت سے لوگوں کے لئے راقم کی یہ صراحت ایک ”انکشاف“ کا درجہ رکھتی ہو، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ایک پاکستانی صاحب علم و قلم بزرگ کے دورہ ترکی کے مشاہدات سے چند اقتباسات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں تاکہ مصطفیٰ کمال کے ”اجتہادات“ اور اس پر ترکی قوم کے رد عمل کی وضاحت ہو جائے۔

یہ بزرگ ہیں جناب ظلیل حامدی صاحب، جنہوں نے آج سے چوبیس سال قبل 1968ء میں ترکی کا دورہ فرمایا تھا اور اپنے مشاہدات و تاثرات قلم بند فرمائے تھے۔ جناب ظلیل حامدی صاحب ایک ترکی عالم شیخ الاسلام عمر نصوحی سے ملاقات کی تفصیل اور ان کی زبانی ترکی میں لادنیث کی تاریخ پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

”شیخ عمر نصوحی کا پورے ملک میں بڑا زبردست احترام پایا جاتا ہے۔ اسلامی فقہ پر موصوف کو زبردست عبور حاصل ہے۔ انہوں نے اس دور میں بھی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ہے جب یہ شغل جاری رکھنے والوں کے سر قلم ہوتے رہے اور دین کو کھڑ کر

رکھنا آج کا انگارہ مٹھی میں لینے کے مترادف تھا۔

میں نے شیخ عمر فصوحی سے اس دور کے حالات سننے کی خواہش ظاہر کی جب ترک قوم کو دین سے بیگانہ کرنے کی مہم چل رہی تھی۔ کیونکہ شیخ عمر فصوحی نہ صرف یہ کہ اس دور کے عینی شاہد ہیں بلکہ خود ان حالات کو بھگت چکے ہیں۔ شیخ فصوحی پچھلے حالات کو چھیننا پسند نہ کرتے تھے۔ انہوں نے اس پر مسرت کا اظہار کیا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے دین پر جو طوفان خیز آزارتیشیں ٹوٹیں اور پورا ملک ایک شبہ تاریک میں تبدیل ہو گیا، وہ اب ختم ہو رہی ہیں اور قبل اس کے کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہوں، وہ اپنی آنکھوں سے نوجوانوں کے اندر دین کی عام بیداری کے ایمان افروز مہر دیکھ رہے ہیں۔ شیخ نے بتایا کہ ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک جو ملک اسلام کا گوارا رہا، بلکہ اسلام کا محافظ رہا، اسے صرف آٹھ سال کے اندر اسلام سے بیگانہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ 1924ء سے تبدیلی کا یہ سلسلہ شروع ہوا اور 1932ء تک جاری رہا۔ موضوع نازک تھا، سب کے دلوں کے تاریل گئے۔ مجلس میں ایک اور صاحبِ علم بیٹھے تھے۔ انہوں نے تاریخی ترتیب کی رعایت سے بتایا کہ سلطان وحید الدین آخری عثمانی خلیفہ تھے۔ مصطفیٰ کمال نے 29 اکتوبر 1923ء کو انہیں اقتدار سے محروم کر دیا اور صرف امور مذہبی کے سربراہ کی حیثیت سے ان کو باقی رکھا۔ 3 مارچ 1924ء کو ہالائٹو میشل اسمبلی نے خلافت پر بھی حلفِ منسوخ پھیر دیا۔ اسمبلی نے اسی اجلاس میں وزارتِ شریعت اور وزارتِ اوقاف کو بھی منسوخ کر دیا۔ کچھ دنوں بعد شریعت عدالتیں ختم کر کے انہیں رسولِ عدالتوں کے اندر ضم کر دیا گیا۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال نے دوسرا بھر پور قدم اٹھایا اور تمام دینی مدارس اور دینی اداروں کو بند کر دیا اور ایک بے اختیار اور نیم مردہ سا مذہبی ادارہ ”محکمہ امور مذہبی“ کے نام سے کھول دیا۔ بلکہ حکومت نے دینی تعلیم کے معاملے میں یہاں تک تشدد برتا کہ پرائمری اسکولوں کے اندر چھوٹے چھوٹے بچوں کو یہ سکھانا شروع کر دیا کہ ہماری پسماندگی کا اصل سبب دین ہے۔ ترکوں کو جتنے مصائب و حوادث کا سامنا کرنا پڑا ہے ان سب کا ذمے دار دین ہے۔ حکومت نے باقاعدہ سابقہ دستور کے اندر سے یہ فقرہ حذف کر دیا کہ ”ریاست کا مذہب اسلام ہو گا“۔ اس تبدیلی کے بعد تمام اسلامی قوانین منسوخ کر دیئے، اسلامی شریعت کو یہ لوگ ”شریعتِ حقیقت“ کہتے تھے یعنی بوسیدہ قانون۔ اسلامی قوانین کے بجائے ان لوگوں نے سوشلزم لینڈ کا سول لاء اور اٹلی کا فوجداری قانون، عوام الناس کی روایات و عادات کا لحاظ کئے بغیر ٹھونس دیا۔ شروع شروع میں تو خود جج ان نئے اور ٹانائوس قوانین کی وجہ سے سخت ذہنی اور فکری

پرانگندگی میں جتلا ہو گئے اور عدالتوں کے اندر کئی کئی سال تک مقدمات فیصلے کے بغیر بڑے رہے۔ علیٰ ہذا القیاس صوفیاء کے تمام سلسلے بھی ممنوع قرار دے دیئے اور عیسائی پادریوں کی طرح علماء کے لئے ایک خاص یونیفارم مقرر کیا یعنی سیاہ جبہ اور سفید عمامہ۔ عوام الناس کو ہیٹ اور سوٹ پہننے پر مجبور کیا گیا، ایک کروڑ باشندوں کے لئے یکایک اتنی بڑی مقدار میں سوٹ ہیٹ فراہم کرنا آسان کام نہ تھا، اس غرض کے لئے یورپ بھر سے ہر طرح کا رزی (CONDEMMED) مال درآمد کیا گیا۔ جمعۃ المبارک کی بجائے اتوار کو چھٹی کا دن قرار دیا گیا۔ حکومت نے مذہبی احساسات کو یہاں تک کچلنے کی کوشش کی کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے اجتماعات بھی اسے گوارا نہ تھے۔ اس نے ان اجتماعات کو بھی پہلے خلاف قانون قرار دے دیا اور پھر اس قانون پر جب بہت اضطراب پیدا ہوا تو پھر اسے تبدیل کر دیا گیا، جبری جنتزی کو ختم کر دیا گیا، عربی اذان ممنوع قرار دے دی، وراثت کے قانون میں بنیادی تبدیلی کر ڈالی اور مرد و عورت کو وراثت میں برابر کا حصہ دار ٹھہرا دیا گیا۔ وراثت کے اصل حصے داروں (ذوی الارحام) کو فروغ بنا دیا اور قانونی نظام کے اندر ایسا انتشار پیدا ہوا کہ تو بہ ہی بھلی۔ ترقی کا اسلام سے ہر طرح کا رشتہ کاٹنے کے لئے بالاخر دارالحکومت کو استنبول سے انقرہ تبدیل کر دیا گیا، کیونکہ استنبول مسجدوں اور مذہبی اداروں کا شہر ہے اور یہاں کے چپے چپے سے عثمانی تہذیب جھلک رہی ہے۔ اس لئے ایک نئی زندگی کا افتتاح کرنے کے لئے یہ شہر موزوں نہ سمجھا گیا، انقرہ ایک معمولی سا قصبہ تھا اسے دارالحکومت بنا دیا گیا اور شہر کے اندر مسجد کی تعمیر ممنوع قرار دی گئی۔ اس ملک پر سب سے زیادہ آزمائش کی گھڑی وہ تھی جب عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ یہ تبدیلی چونکہ تاریخ، فطرت اور روایات کے سراسر خلاف اور معقولیت کے ہر پہلو سے عاری تھی اس لئے نہ صرف عوام کے لئے اس کو قبول کرنا آسان نہ تھا بلکہ خود حکومت کو بھی سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت نے اپنے تمام ذرائع اس تبدیلی پر لگا دیئے اور ان تمام لوگوں کو جو لاطینی حروف کا علم رکھتے تھے، جمع کیا گیا اور انہیں عوام کی تعلیم کے لئے بہ جبر مامور کیا گیا۔ 2 اگست 1928ء کو پہلی مرتبہ انقرہ کے اندر لاطینی حروف کے رواج کا اعلان کیا گیا اور اس اعلان کے ساتھ وہ تمام مطبوعہ کتابیں جو عربی زبان میں موجود تھیں، انہیں جمع کر کے مصر، ایران اور دوسرے ممالک کو برآمد کر دیا گیا، چھاپہ خانہ والوں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ عربی حروف کی پلٹیں چھاپہ خانوں میں نہیں رکھ سکتے۔ کالجوں کے نصاب میں سے عربی اور فارسی زبانیں نکال دی گئیں کیونکہ اب ان کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اسی برکتاً نہ

کیا گیا بلکہ ترکی زبان کے اندر سے عربی اور فارسی کے الفاظ کو جن جن کر نکالا گیا اور ان کے بجائے ترکی زبان کے عامی الفاظ کو شامل کیا گیا یا فرانسیسی الفاظ کو اختیار کیا گیا۔ 1945ء میں ترکی کا دستور لاطینی زبان میں شائع ہوا۔

(”ترجمان القرآن“ لاہور، جلد 70، شماره 6، ہفت فروری 1969ء۔ بعد میں یہ سفر نامہ

— ترکی، قدیم و جدید — کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو
ص 40-44، طبع دوم)

اس کے بعد جناب حامدی صاحب نے ”لاذیغیت کے نفاذ کا رد عمل“ کے عنوان سے ترکی کے مسلم عوام کی اس مزاحمت اور رد عمل کا تذکرہ کیا ہے جس کا ظہور مصطفیٰ کمال کے ”اجتماعات“ کے بعد ہوا اور اپنے ”اجتماعات“ کے نفاذ کے لئے جو جبر و تشدد ہائی انقلاب کی طرف سے کیا گیا، اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب ہے، چونکہ صفحات زیادہ تفصیل کے مہتمل نہیں، اس لئے شائقین اصل کتاب ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ تاہم دینی تعلیم اور دینی اداروں پر پابندی کے بعد ترکوں نے دینی تعلیم کا سلسلہ جس خفیہ طریقے سے جاری رکھا، اس سلسلے میں بھی ایک اقتباس پیش کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ جناب حامدی صاحب شیخ بیٹار کی رہائی لکھتے ہیں

”شیخ بیٹار نے بتایا انہوں نے جالوی تک ترکی کے سیکولر اسکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد انہیں دینی تعلیم اور عربی کا شوق پیدا ہوا۔ مگر یہ شوق کیسے شرمندہ جمیل ہو؟ ملک کے اندر سیکولر تعلیم کا غلبہ تھا، اور دینی تعلیم کے حصول کے لئے ملک سے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ یہ مشکل صرف شیخ بیٹار کے لئے پریشانی کی موجب نہ تھی بلکہ تمام ترک مسلمانوں کے لئے تھی و اضطراب کا سبب بن چکی تھی۔ مگر ترک مسلمان اس لحاظ سے غیر معمولی داد و تحسین کا مستحق ہے کہ اُس نے ”دوز سیاہ“ میں بھی ”بہر کنعان“ سے تعلق نہ توڑا اور اپنی ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیا۔ جب عربی اذان ممنوع تھی تو گھروں کے اندر چھپ چھپ کر عربی میں اذان دیتے اور نماز پڑھتے۔ شادی بیاہ کے قوانین اسلامی شریعت کے خلاف دیکھے تو اس میں بھی بڑا دلچسپ راستہ پیدا کر لیا (جس کی تفصیل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے) دینی اور عربی تعلیم کے لئے بھی انہوں نے خطر پسندی کا ثبوت دیا اور زمین دوز دینی مدرسے قائم کر دیئے۔ زمین دوز دینی مدرسوں کا وسیع نظام تھا اور پولیس بڑی جدوجہد اور جبر و تشدد کے باوجود ان کا سراغ لگانے میں ناکام رہتی تھی۔ ان درسوں میں تعلیم دینے والے اور تعلیم حاصل کرنے والے دونوں اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے

پہوتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ان پر کما حقہ صادق آتے تھے کہ
 كَلَّفَا بَعْضُ عَلِيٍّ النَّبِيَّ (گویا آگ مٹی میں لے رکھی ہے) شیخ یثار نے بتایا کہ انہوں نے بھی
 ایسے ہی ایک مدرسے میں چار سال تک تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کی دینی معلومات اور عربی کا
 ذوق اسی مدرسے کا رہین منت ہے۔

شیخ تانے لگے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اندر درس ہو رہا تھا۔ استاذ طلبہ کے سامنے فقہ
 کے کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے، میں بھی ان میں شریک تھا۔ دریں اثناء یکایک باہر کا
 دروازہ کھٹکایا گیا۔ ہمیں متعلقہ آدمی نے اشارہ کر دیا کہ پولیس دروازے پر ہے اور وہ اس
 مدرسے پر چھاپہ مارنا چاہتی ہے۔ چنانچہ ہم تمام طلبہ مع کتابوں کے ایک ایسے خفیہ دروازے
 سے نکل گئے جسے ہم ”بیرجنسی گیٹ“ کہا کرتے تھے۔ ہمارے استاذ نے دروازہ کھولا، پولیس
 کے سپاہی دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور بڑی چابک دستی کے ساتھ ادھر ادھر انہوں
 نے ہاتھ مارے۔ مگر انہیں کوئی ایسی چیز ہاتھ نہ لگی جس سے یہ ثابت کر سکیں کہ یہاں
 ”رجعت پسندوں“ اور ”تغلاب دشمنوں“ کا کوئی اڈا ہے۔ استاذ کو دھمکیاں دیں، مگر انہوں
 نے کہا کہ یہ ذاتی رہائش گاہ ہے، تم جس شبہ کی بناء پر یہاں آئے ہو وہ درست نہیں ہے۔
 آخر کار پولیس کا دستہ خائب و خاسر واپس لوٹ گیا۔ اگر اس وقت ذرا بھی غفلت یا سستی
 ہو جاتی یا ”رصد گاہ“ کا نظام ڈھیلا ہو جاتا تو یقیناً ہم پولیس کے قبضے میں ہوتے اور موت کی
 سزا سے لے کر عمر قید کی سزا تک سے دوچار ہوتے۔ وہ دور سخت مشکلات کا دور تھا، میں
 نے ان مشکلات کی طوفان خیز فضا میں چار سال گزارے ہیں۔ حکمرانوں کو ضد تھی کہ ترکی
 میں عربی کا ایک لفظ سنائی نہ دے اور ہم درویشوں کو ضد تھی کہ عربی سے ہمیں کوئی محروم
 نہیں کر سکتا۔ یہ ہمارا سرمایہ ایمان ہے۔ اور ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سبک گراں اور
 اس وقت ”اس سرزمین کا بطن اس کے ظاہر سے بہتر تھا“ کیونکہ ظاہر ”یَقُولُ اَنَا كُرْك“
 (ترکوں کا باپ یہ کہتا ہے) پکار رہا تھا اور بطن ”قَالَ اللَّهُ وَقَالَ الرَّسُولُ“ (خدا اور اس کے
 رسول نے فرمایا) کہہ رہا تھا۔ شیخ یثار نے بتایا کہ زمین دوز خفیہ عربی مدرسے ارض روم اور
 مشرقی علاقے میں بکھرتے پہلے ہوئے تھے اور ان علاقوں میں آج بھی ایسے لوگ کثیر تعداد میں
 ملیں گے جنہوں نے ان مدرسوں میں تعلیم پائی ہے

(ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ لاہور۔ جلد 72، شمارہ 2، بابت اکتوبر 1969ء ص 54-55)

ترکی۔ قدیم و جدید، ص 188-191 طبع دوم۔ لاہور)

ان مذکورہ تفصیلات سے ہر شخص بہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ترکی میں جو تبدیلی آئی وہ ”اجتہاد“ تھا یا اسلام سے انحراف و بغاوت کی منظم سازش اور جدوجہد؟ اس کے بعد یہ فیصلہ بھی آسانی سے ہو سکے گا کہ اسے ”اجتہاد“ کہا بھی جاسکتا ہے؟ علاوہ ازیں خود علامہ اقبال بھی مصطفیٰ کمال کے بارے میں جو حسن ظن رکھتے تھے، اس کے بعد کے اقدامات سے اس میں فرق آگیا تھا اور اپنی رائے تبدیل کر لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں ”ترکی کے مصطفیٰ کمال اور امیر ان کے رضا شاہ پہلوی سے بھی اقبال واقعی طور پر متاثر ہوئے۔ لیکن بالاخر ان دونوں سے ناامید اور مایوس ہوئے اور اسی ناامیدی اور مایوسی کے عالم میں فرمایا

۔ مری نوا سے گریبان لالہ چاک ہوا
نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اسکی

۔ نسیم صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
کہ مدحِ شرقِ بدن کی تلاش میں ہے ابھی

(زندہ رود۔ ص 146، ج: 3)

(2)۔ جمہوری طرز حکومت کیا روح اسلام کے عین مطابق ہے؟

یہ دعویٰ کہ جمہوری طرز حکومت روح اسلام کے عین مطابق ہے، اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ خلافت و سیاست میں جمہوری اقدار موجود ہیں، اس میں انہماک رائے پر پابندی نہیں ہے، خلفاء و عمال کو حکومت پر تنقید کی اجازت ہے، حکمران احتساب سے بالا نہیں ہیں، حکمران عوام کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے ذمے دار ہیں اور اہل صلاح افراد سے مشاورت کا اہتمام ان کے لئے ضروری ہے۔ تو یہ ”جمہوریت“ بلاشبہ اسلام میں ہے۔

اور اگر فاضل مقالہ نگار کے نزدیک اس سے مراد مغربی جمہوریت ہے تو رقم علی وجہ البعیرت کتا ہے کہ اسے روح اسلام کے عین مطابق قرار دینا حقائق کے یکسر خلاف ہے۔ بلاشبہ شاطرانِ مغرب نے ”جمہوریت“ کا نام اس زور سے پھونکا ہے کہ بڑے بڑے اہل علم بھی اس زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے ہیں اور شاید جمہوریت کی عشوہ طرازیوں نے سب کو اپنا گردیدہ بنا لیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمہوریت کی جو عام تعریف کی جاتی ہے

۔ ”عوام کی حکومت“ عوام کے ذریعے سے، عوام کے لئے۔

اس کا عملاً دنیا میں کہیں بھی وجود نہیں ہے۔ بلاشبہ عوام کو ووٹ دینے کا حق ضرور حاصل ہے اور اس طرح انہیں حکومت میں شریک اور حصے دار بھی باور کرایا جاتا ہے۔

لیکن

○ ایک تو وہ حضرات جو خطابت و طلاقتِ لسانی کے جوہر سے فیض یاب، دولت کی فراوانی اور ہر طرح کے وسائل سے بہرہ ور اور وسیع اثر و رسوخ یا اونچے جاہ و منصب کے حامل ہوں، عوام کی رائے کو نہ صرف بُری طرح متاثر کر لیتے ہیں بلکہ بسا اوقات انہیں سخت گمراہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت اپنی رائے کا شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط استعمال کرتی ہے جس کا سارا فائدہ ابن الوقت، خود غرض، مخصوص مفادات کے اسیر اور شاطرو عیار قسم کے لوگوں کو ہی پہنچتا ہے۔ ہمارے اپنے ملک کی 45 سالہ سیاست اس پر شاہدِ عدل ہے۔

○ دوسرے، منتخب شدہ افراد انتخاب کے بعد عوام کی رائے، ان کے مسائل اور ان کے جذبات کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتے، وہ اپنا تمام حق حکمرانی یا حق نیابت مخصوص اغراض و مقاصد کے لئے یا مخصوص مفادات کے حامل ٹولے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور یوں یہ اسمبلیاں بالعموم عوامی مسائل کے حل کے بجائے جگہ زرگری یا اقتدار کی رنہ کشی کے اڈوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

○ علاوہ ازیں اور بھی خرابیاں ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ کہیں کہ یہ خرابیاں صرف ایشیائی اور ترقی پذیر ملکوں میں ہی پائی جاتی ہیں جہاں ابھی تعلیم اور سیاسی شعور کی کمی ہے، جو تعلیم کی شرح میں اضافے اور سیاسی پختگی سے ختم ہو جائیں گی۔ لیکن جن اہل نظر کو خود انگلینڈ اور یورپ جا کر ”جمہوریت“ کے مشاہدے کا موقع ملا ہے، انہوں نے وہاں بھی یہی کچھ دیکھا ہے۔ چنانچہ پاک و ہند کی مسئلہ اسلامی علمی شخصیت مولانا سید سلیمان ندوی اپنے دیارِ فرنگ کے تاثرات میں لکھتے ہیں

”یورپ کی جمہوریت کا ساری دنیا میں غلط فہمی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی ایک طبقے کی حکومت رہتی ہے، جس میں عوام کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور حقیقی جمہوریت وہاں بھی مفقود ہے۔ ہندوستان میں بیٹھ کر یورپ کی جمہوریت اور آزادی و حریت کے بڑے قصے سنے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عملاً یہاں بھی اربابِ حکومت اسی درجہ مستبد ہیں جس درجہ مشرق میں۔ عوام کو صرف یہ اختیار ہے کہ ممبر منتخب کر لیں، ممبروں کو یہ اختیار ہے کہ وزراء کو منتخب کریں۔ اس کے بعد عوام کو ممبروں پر اور نہ ممبروں کو وزراء پر اختیار ہے۔“

فرانس جو ری پبلک کہلاتا ہے، وہاں کی حالت انگلینڈ سے بھی بدتر ہے، عوام کو حکومت کی پالیسی میں ذرہ برابر دخل نہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہاں سوشلزم کے برگ و بار پیدا کرنے کے کیا اسباب ہیں؟ یہاں امیرو غریب طبقوں میں معاشرتا اس درجہ بُحد ہے جس قدر خدا اور بندے میں۔ (حیاتِ سلیمان، از شاہ معین الدین احمد ندوی ص 197)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں

”یورپ کی جمہوریت کا زُعب تو یہاں آکر فوراً اتر گیا، یورپ کی جمہوری ترقی کی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ ابتدائے ایام میں صرف مالک بادشاہ ہوتا تھا، اس کے بعد زمین دار اور تعلقہ دار و نواب مالک ہو گئے جن کو ٹوریزیا کنسرویٹوز کہتے ہیں۔ اب تمام تر قوت تاجروں، دولت مندوں اور سوداگروں کے ہاتھوں میں ہے جن کا نام لبرل ہے، ان کی سیاست کا مقصد صرف اپنی تمہارت کی رونق اور دولت کا حصول ہے اور بس“

(حیاتِ سلیمان۔ ص 205)

جمہوریت کے معلم فرانس کی جمہوریت کے بارے میں لکھتے ہیں

”فرانس کی جمہوریت اور آزادی کا افسانہ تو بہت سن چکا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قوم انگریزوں سے بھی زیادہ مستبد اور اقتدار پسند ہے۔ عوام کو سلطنت میں کوئی دخل نہیں۔ صرف اربابِ جاہ و ثروت کے ہاتھوں میں حکومت ہے۔ پہلے یہ سن کر بہت خوشی تھی کہ فرنج اپنی حکومت کو شہنشاہی و بادشاہی اور نو آبادیوں کو محکوم اقوام اور دیگر اقوام محکومہ کو انگریزوں کی طرح رعایا نہیں کہتے، بلکہ اپنی حکومت کو کاسن و سلطنت (دولتِ مشترکہ) اور رعایا کو سٹیژن یعنی شہری کہتے ہیں۔ گویا فرانس کے زیر سایہ بسنے والے ایک ملک و شہر کے سب بھائی بھائی ہیں۔ لیکن اسوس یورپ آکر معلوم ہوا کہ ہر لفظ سے اس کا اصل مضمون مراد لینا ضروری نہیں۔ جیسے لیگ آف نیشنز (مجلسِ اقوام) انڈی پینڈنٹ (استقلال و خود مختاری) مانڈٹ (حکم برداری) سلف ڈر مینشن (اختیارِ ذاتی) وغیرہ الفاظ کے معنی یورپ میں وہ نہیں سمجھے جاتے جو ایشیا میں از روئے لغت سمجھے جاسکتے ہیں۔ فرانس کا حق شہریت فرنج۔ انڈیا، مراکش، الجزائر اور تونس وغیرہ کے باشندوں کو آپ جانتے ہیں، کب حاصل ہو سکتا ہے؟ جب وہاں کے باشندے فرنج قانون اختیار کر لیں، فرنج حکومت تسلیم کر لینے کے بعد فرنج قانون اختیار کرنے کے معنی آپ سمجھے؟ لیکن دیگر قوانین حکومت کے ساتھ نکاح، طلاق، وراثت اور دیگر معاملات میں اپنا مذہبی و قومی قانون چھوڑ دیا جائے، جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسلام یا ہندو دھرم کو خیر باد کہو، تب فرانس کے حق شہریت کی دولت

عقلی مل سکتی ہے اور تب نوآباد کاری کا باشندہ ایک فرنج کے برابر اور مساوی حقوق پاسکتا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اپنی قومیت و جنسیت چھوڑ کر فرانسیسی قومیت اختیار کر لو۔ ظاہر ہے کہ مسلمان اس کو قبول نہیں کر سکتے، اس لئے وہ جن شہریت سے محروم ہیں اور حقوق میں ایک فرنج مین کے برابر نہیں ہو سکتے۔ جمہوریہ فرانس کا شعار (مونو) یہ چار الفاظ ہیں۔

اخوت، مساوات، عدالت، آزادی

حکومت کے ہر دفتر اور ایوان کے صدر دروازے پر یہ الفاظ آپ کو کندہ ملیں گے لیکن اس کے معنی وہ نہ سمجھیں جو لغت کی زبان آپ کو بتاتی ہے۔

ایک مشہور فرانسیسی مستشرق لوئی مینان کی مجھ سے خط و کتابت ہوئی، تو میں نے پوچھا کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں، اس نے سچ کہا کہ ان الفاظ کو نہ دیکھو جو دیوار و در پر کندہ نظر آتے ہیں، بلکہ ان کو دیکھو جو دلوں میں منقوش ہیں

(حیاتِ سلیمان۔ ص 206، طبع اعظم گڑھ)

یہ ہے فرانس، یورپ اور انگلینڈ کی جمہوریتوں کا حال، جن کی صدائے بازگشت سے ساری دنیا گونج رہی ہے اور اشتراکی ملکوں کی جمہوریتوں کا جو حال ہے، وہ تو محتاج وضاحت ہی نہیں۔

جمہوریت کے بارے میں علامہ کی رائے۔۔۔ انہی جمہوریتوں کے بارے

میں، جن کا مشاہدہ علامہ نے بھی خود یورپ میں رہ کر کیا تھا، یہ فرمایا اور بالکل بجا فرمایا ہے وہی سائز کن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردے میں نہیں فرمازے لوائے قیصری دیوار استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیم پری مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق طلبہ مغرب میں مزے ٹھے اثر خواب آوری گری، گفتار اعضاء مجالس الاماں یہ بھی سرمایہ داروں کی ہے جگہ زرگری اس سراب رنگ و بو کو گھٹاں سمجھا ہے تو آہ اے نادان نفس کو آسٹیاں سمجھا ہے تو

(بانگ درا، ص 262)

”ضرب کلیم“ میں مو فرنگی کی زبان میں جمہوریت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

اس راز کو اک مو فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گینا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے

☆

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر

۔۔۔ (ارمغانِ حجاز)

ہم نے خود شای کو پسنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

۔۔۔ (ارمغانِ حجاز)

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری

۔۔۔ (ارمغانِ حجاز)

اٹھا کر پینک دور باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
ایکشن، مہری کونسل، صدارت
ہائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

فارسی کلام

محتاج معنی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
زموراں شوخی طبع سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

۔۔۔ پیامِ مشرق

یہ اشعار اپنے مفہوم میں واضح ہیں، اور انہی امور کی تائید کرتے ہیں جن کی طرف ہم
اشارہ کر آئے ہیں نیز مغربی جمہوریت سے علامہ کی بیزاری بھی ان سے عیاں ہے۔ کلام

اقبال کے شارحین بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں، چنانچہ ہم ذیل میں صرف دو انتہائی معتبر شارحین کی صراحت پیش کرنے پر فی الحال قناعت کریں گے۔ ایک ڈاکٹر یوسف حسین خاں، جو خود بھی قدیم و جدید تعلیم سے آراستہ اور فرانس کے تعلیم یافتہ ایک بلند پایہ اہل علم و اہل قلم تھے۔ ان کی ”روح اقبال“ اقبالیات میں ایک نہایت وسیع اور کراں قدر کتاب سمجھی اور مانی جاتی ہے۔ اور دوسرے خود علامہ کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال، جن کے مستند ہونے میں شک ہی نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ ڈاکٹر جاوید اقبال فرماتے ہیں۔

”جمہوری طرز حکومت پر ایک مفکر کی حیثیت سے ان کا اعتراض خالصتاً اخلاقی اور اصولی تھا کیونکہ اس میں انتخاب کی بنیاد ووٹوں کی گنتی پر رکھی جاتی ہے اور اس گنتی میں ایک صحیح یا مناسب امیدوار محض ایک ووٹ کم پڑنے سے کسی غلط یا غیر مناسب امیدوار کے مقابلے میں شکست کھا سکتا ہے۔ جمہوری نظام کے اس نسقم کا اعتراف ہر سیاسی مفکر نے کیا ہے۔ اسی طرح وہ برصغیر میں ایسے جمہوری نظام کے انعقاد کے بھی خلاف تھے جس سے مسلمان من حیث القوم ایک اقلیت میں منتقل کر دیئے جائیں۔ نیز انہیں یہ خدشہ تھا کہ کسی بھی پسماندہ ملک میں، جس کے عوام زیادہ تر آن پڑھ، غیر منظم اور فاقہ کش ہوں، وہاں جمہوریت کا تعارف سیاسی اہتری، معاشی تباہی، قومی انتشار اور ملک کے ٹوٹنے کا سبب بن سکتا ہے۔ اقبال نہ مغرب کے سیکولر جمہوری نظام کے حامی تھے، نہ آج کے دور میں اسلام کے روایتی تصور ریاست (یعنی خلافت) کو کوئی اہمیت دیتے تھے“

(زندہ رود، ج 3، ص 660-661)

1931ء میں علامہ جب انگلستان جانے لگے تو ایک صحافی نے علامہ کا انٹرویو لیا اور اس میں اس نے حضرت علامہ سے مختلف سوال کئے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں

”سوال کیا گیا کہ وہ شاہی نظام کے حق میں ہیں؟ جواب دیا کہ وہ شاہی نظام قائم رکھنے کے حق میں نہیں ہیں، مگر جمہوریت کے بھی دل سے قائل نہیں، وہ جمہوریت کو محض اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے“ (زندہ رود، ج 3، ص 440)

اپنے سال وفات کی یکم جنوری 1938ء کو علامہ نے نئے سال کا ایک پیغام دیا جو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نشر کیا گیا۔ اس میں آپ نے فرمایا

”عمد حاضر علم و دانش اور سائنسی اختراعات میں اپنے بے مثال ترقی پر بجا طور پر مفتخر ہے۔ آج زمان و مکان کی تمام وسعتیں سمٹ رہی ہیں اور انسان قدرت کے راز افشا

کر کے اس کی قوتوں کو اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرنے میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔ لیکن تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں لوہیت کے جبرو استبداد نے ڈیموکریسی (جمہوریت) بیخوشترم (قوی پرستی) کیونزم (اشتراکیت) فاشیزم (فسطائیت) اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا کے کونے کونے میں قدر حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک ورق بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ نام نہاد سیاست دان، جنہیں قیادت عوام اور انتظام حکومت کی ذمے داری سونپی گئی تھی، قتل و غارت اور ظلم و استبداد کے سیاہین ثابت ہوئے ہیں اور ان حاکموں نے، جن کا فرض ایسی اقدار کی سرپرستی اور تحفظ تھا جو اعلیٰ انسانیت کی تشکیل و تعمیر کا سبب بنتی ہیں، اپنے اپنے مخصوص گروہوں کے طمع اور حرص کی خاطر لاکھوں انسانوں کا خون بہایا ہے اور کروڑوں کو اپنا محکوم بنا لیا ہے۔ (زندہ رود، ج 3 ص 634)

مذکورہ اقتباسات میں علامہ اقبال کی اپنی تصریحات بھی آگئی ہیں جن سے ان کے ان اشعار کی تائید ہوتی ہے جن میں انہوں نے مغربی جمہوریت پر تنقید کی ہے۔

اور اب ملاحظہ فرمائیے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تصریح، فرماتے ہیں

”اقبال جدید مملکت کی جمہوری تنظیم کو ہر ملک کے لئے موزوں نہیں سمجھتا، یہی جمہوریت جو کمزور قوموں کے حقوق کی علم بردار بن کر اٹھی تھی، آج لوہیت کے پست ترین مناظر دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے۔ فرانسیسی جمہوریت کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ انقلاب کے وقت ”قوم زندہ باد“ کا جو نعو بے بس مخلوق کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے بلند کیا گیا تھا، وہی بعد میں جمہوری فرانس کی سلطنت کو وسیع کرنے اور دوسروں کو غلام بنانے کے لئے استعمال کیا گیا۔ قوت و اقتدار کا جذبہ تمدن دنیا کا سب سے زیادہ مؤثر جذبہ ہے جس کا شکار خود جمہوریتیں بن گئیں۔ پھر موجودہ جمہوریت کے خارجی مظاہر ایسے ’مٹھنے‘ زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والے اور غیر مستحقوں کو سیاسی اقتدار کی گدی پر بٹھانے والے ہیں کہ اگر اقبال بھی اس دور کے دوسرے نامور مفکروں کی طرح ان سے بیزار ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔“ انسانیت کے تمام اہم فیصلوں کو جو زندگی کے رخ بدلنے والے ہوں محض تعداد کے تابع کر دینا انسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ جمہوریت کا بڑا عیب جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ وہ شمار کرنا تو جانتی ہے لیکن وزن کرنا نہیں جانتی جس کے بغیر ہیئتِ اجتماعیہ میں عدل و اعتدال قائم نہیں رہ سکتا۔“ (”روحِ اقبال“ ص 228-229 ادارہ اشاعتِ اردو۔ حیدر آباد، دکن)

کیا جمہوریت کی مخالفت کا کوئی مخصوص پس منظر تھا؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علامہ اقبال نے متحدہ ہندوستان میں ایک مخصوص پس منظر کی وجہ سے جمہوریت کو ناقابل قبول قرار دیا تھا اور اس پر سخت تنقیدیں کی تھیں۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر اقتدار کی بائیں ہندو اکثریت کے ہاتھوں میں چلی جاتیں اور مسلمان ایک محکوم قوم کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے۔ اس لئے اس پس منظر میں جمہوریت کی مخالفت بالکل صحیح تھی، تاہم علامہ کی اس مخالفت جمہوریت کو اسلامی ممالک پر چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اسلامی ملکوں کے لئے تو انہوں نے جمہوری طرز حکومت ہی کو روح اسلام کے عین مطابق قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ آمریت و شہنشاہیت کے بھی خلاف تھے، بنا بریں اب جمہوریت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

یہ بات بلاشبہ اپنی جگہ صحیح ہے کہ متحدہ ہند میں جمہوریت کا مطلب ہندو اکثریت کا غلبہ ہی تھا، یہ بھی صحیح ہے کہ علامہ آمریت و ملوکیت کے بھی خلاف تھے۔ لیکن اس کے ہمتا ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ مغرب کی سیکولر جمہوریت کے بھی قطعاً حامی نہیں تھے۔ اس لئے ایک مخصوص پس منظر کے باوجود جمہوریت پر ان کی تنقید ایک اصول کے طور پر تھی کہ جمہوریت شمار کرنا جانتی ہے، وزن کرنا نہیں جانتی۔ اور علامہ کا یہ اعتراض علیٰ حالہ قائم ہے۔ علاوہ ازیں علامہ کا یہ خدشہ بھی کہ

”کسی بھی پسماندہ ملک میں، جس کے عوام زیادہ تر آن پڑھ، غیر منظم اور فاقہ کش ہوں، وہاں جمہوریت کا تعارف سیاسی ابتری، معاشی تباہی، قومی انتشار اور ملک کے ٹوٹنے کا سبب بن سکتا ہے“۔ (زندہ رود ج 3 ص 660)

ایک امر واقعہ کی صورت میں رونما ہو چکا ہے اور ہمارا ملک اس مغربی جمہوری تماشے کی بدولت دو نخت ہو چکا ہے اور یہ جمہوری تماشہ اگر اسی طرح جاری رہا تو نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ ہمیں اور کیا کچھ دیکھنا پڑے گا؟ اگرچہ ہماری دعا اور خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مزید کوئی روز بد نہ دکھائے۔ لیکن محض ہماری خواہشوں سے حقائق تو تبدیل نہیں ہو سکتے تاآنکہ ہم حالات و واقعات کا دھارا بدلنے کے لئے کوئی موثر اور مفید اقدام نہ کریں۔

پس چہ پاید کرد؟ اس لئے ضرورت ہے کہ مغرب کی نقالی اور اندھا دھند تقلید کی بجائے ہم کوئی ایسا طرز حکومت وضع اور اختیار کریں کہ جس میں جمہوری روح بھی کار فرما ہو اور مغرب کی تعارف خرابیوں سے پاک بھی ہو۔ راقم کے نزدیک موجودہ اسلامی ملکوں کا مغربی جمہوریت کی اندھا دھند تقلید کرنا فساد کا بہت بڑا منبع ہے۔

اس جمہوریت کی بدولت

○ تمام اسلامی ممالک بری طرح نظریاتی و فکری انتشار کا شکار ہیں، کیونکہ ہر نظریے اور فکر کی تبلیغ و اشاعت کی عام اجازت ہے اور اس پر پابندی ”جمہوریت“ کے خلاف سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ ایک اسلامی مملکت میں غیر مساویوں کو رہنے کا حق تو ضرور حاصل ہے، اسلامی مملکت ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمے دار بھی ہے اور انہیں اپنی عبادت گاہوں میں اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے کی بھی پوری آزادی ہے۔ لیکن انہیں اپنے مذہب کی تبلیغ اور پرچار کی اجازت نہیں۔ یہ نسطائیت نہیں بلکہ ایک نظریاتی مملکت کا حق ہے، اس کے بغیر وہ اپنی نظریاتی بنیادوں کو محفوظ و مستحکم بنا سکتی ہے نہ رکھ سکتی ہے۔ لیکن اس جمہوریت کے سبب اسلامی ممالک نظریاتی اکھاڑوں میں تبدیل ہو گئے ہیں، جہاں ازم کا پہلوان اپنے ازم اور نظریے کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر ڈنٹر پیل رہا ہے، دعوت مبارزت دے رہا ہے اور پہلوان ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔

○ اس جمہوریت کی بدولت ہر اسلامی ملک میں ہر قسم کے کاروبار کی اجازت ہے اور ہر شخص کو ہر قسم کا پیشہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ صحافت اگر مادر پدر آزادی کا مظاہرہ کرتی ہے اور وہ اس سطح تک پہنچ جاتی ہے کہ ع

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

تب بھی اس پر کوئی قدغن عائد نہیں کی جاسکتی کہ قدغن جمہوری حق کے منافی ہے۔ کوئی مرد یا عورت یا گروہ کوئی حیا سوز اور محترّب اخلاق پیشہ اختیار کرتا ہے اور مسلمانوں کی نوجوان نسل میں بے حیائی و بے دینی کے زہریلے اثرات پھیلا تا ہے تو یہ بھی ان کا جمہوری حق ہے جس پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔

○ کوئی مذہب کے نام پر بدعت ایجاد کرتا ہے اور اس کا مظاہرہ بھی سڑکوں پر کرتا ہے اور گلی کوچوں میں اس کا مظاہرہ فسادات اور امن شکنی کا باعث بھی بنتا ہے۔ مگر اس پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی کہ اس طرح جمہوری حق متاثر ہوتا ہے۔

○۔ انتخابات کے موقع پر لسانی و علاقائی تعصبات یا برادری اور قبائلی تعصبات پھیلا کر ملک کی جڑیں کھوکھلی کی جاتی ہیں، برادریوں اور خاندانوں کو باہم لڑایا جاتا ہے اور گھر گھر گاڑ اور فساد پھیلا یا جاتا ہے اور یہ سب کچھ جمہوریت کے نام پر کیا جا رہا ہے۔

وعلیٰ بذالقیاس اس قسم کی متعدد خرابیاں ہیں جو جمہوریت کو جوں کا توں اختیار کر لینے کے نتیجے میں اسلامی ملکوں میں عام ہیں اور اس وجہ سے وہ امن و استحکام سے محروم ہیں۔

کیا یہ جمہوریت ہمارے ذہنوں کا علاج ہو سکتی ہے؟ ہمارے درد کا دوا ہوا ہو سکتی ہے؟ ہمارے مسائل کا حل ہو سکتی ہے؟ ملک کی سالمیت و بقاء کی ضامن ہو سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر کیا اسلام کا نفاذ اس کے ذریعے سے ممکن ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر ہم نے مسلمان رہتے ہوئے اس ملک کی ترقی میں حصہ لینا ہے، اس کی نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کرنا ہے، علاقائی و صوبائی تعصبات سے ملک کو محفوظ کرنا اور رکھنا ہے، اسلامی تہذیب و تمدن کو فروغ دینا ہے اور اسلامی اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کا نظام قائم کرنا ہے تو یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم کوئی ایسا نظام حکومت اختیار نہ کریں جو آمریت اور جمہوریت دونوں کی خرابیوں سے پاک ہو۔

جمہوریت کی مخالفت کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ راقم آمریت کا حامی ہے یا فوجی حکومت کی تحسین کر رہا ہے بلکہ مقصود صرف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ جس طرح آمریت یا فوجی حکومت ہمارے مسائل کا حل نہیں، اسی طرح مغربی جمہوریت بھی ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے جس طرح کہ باور کرایا جا رہا ہے۔

راقم کو تسلیم ہے کہ موجودہ دور کے لئے آمریت اور فوجی حکومت قطعاً ناقابل قبول ہے، اس کا متبادل نظام ہمیں سوچنا ہو گا لیکن ”جمہوریت“ کو جوں کا توں اس کا بدل سمجھ لینا بھی غلط ہے۔ اس پر نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے اور متناسب نمائندگی کا اصول یا اور اس قسم کا کوئی معقول طرز انتخاب اختیار کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ اگر اس پہلو پر سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا اور اس کا مناسب اور معقول حل تلاش نہ کیا گیا تو یاد رکھئے جمہوریت کی یہ ناؤ ہمیں کبھی ساحل مراد سے ہٹکتا نہیں کرے گی اور ہم انہی گردابوں میں پھنسے رہیں گے جن میں ہم پینتالیس سال سے پھنسے چلے آ رہے ہیں۔

(3) - کیا تعبیر شریعت کا کلی اختیار صرف پارلیمنٹ کو ہے، نامزد علماء کو نہیں؟

تیسری بات فاضل مقالہ نگار نے حضرت علامہ کے حوالے سے یہ بیان فرمائی ہے کہ اجتہاد اور تعبیر شریعت کا حق منتخب نمائندگان کو ہے۔ نامزد علماء کو یہ حق نہیں دیا جانا چاہئے۔ سارے مقالے کی اصل بنیاد یہی نکتہ ہے اور یہی وہ نقطہ نظر ہے جس میں علامہ اقبال مفرد ہیں، ان کی اس رائے کو اہل علم و فکر میں پذیرائی نصیب نہیں ہوئی۔ کیونکہ انتظامی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی امور و معاملات میں منتخب نمائندگان کا حق قانون سازی تو سب تسلیم کرتے ہیں، ان کے اس حق کا کسی نے انکار نہیں کیا۔ لیکن اس سے بڑھ کر انہیں اجتہاد اور تعبیر شریعت کا بھی واحد اہل اور حق دار قرار دینا یکسر ناقابل قبول ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ”اجتہاد“ ایک شرعی اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے ”شرعی ماخذ کی روشنی میں کسی پیش آمدہ شرعی مسئلے کے حل کرنے کی پوری دیانت داری اور خدا خوفی کے ساتھ، بھرپور کوشش کرنا اور غور و فکر میں تمام علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔“ اور اس کام کا اہل وہی ہو سکتا ہے جس میں مخصوص قسم کی صلاحیت و استعداد ہوگی اور مخصوص اوصاف و شرائط کا وہ حامل ہوگا۔ محض سرمائے کے بل بوتے پر منتخب ہونے والے ارکان اسمبلی کے اندر یہ مخصوص استعداد اور مخصوص اوصاف پیدا نہیں ہو جائیں گے کہ انہیں ”مجتہد“ بھی اور شریعت کی تعبیر نو کا حق دار بھی تسلیم کر لیا جائے۔

زیر بحث نقطہ نظر کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس میں ”اجتہاد“ کے اصطلاحی مفہوم کو نظر انداز کر کے اس کی خود ساختہ تعریف کی گئی ہے کہ کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کا نام اجتہاد ہے۔ (تفصیلی جدید الہیات اسلامیہ - ص 228)

حالانکہ ہر علم و فن کی اصطلاح کا وہی مفہوم لیا جاتا ہے جو اس علم و فن کے ماہرین اور دانشمندان نے متعین کیا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ ایک مخصوص اصطلاح ہے جس کا ایک متعین مفہوم ہے۔ لیکن آج کل ایک گروہ نے ان کے لغوی معنی مراد لے کر صلوة و زکوٰۃ کی وہ حیثیت ختم کرنے کی کوشش کی ہے جو چودہ سو سال سے متفقہ طور پر ملت مسلمہ کے اندر تسلیم ہوتی آئی ہے۔ ظاہر ہے صلوة و زکوٰۃ کی ایسی خود ساختہ تعریف، جس سے ان کی وہ حیثیت ختم ہو جائے، جو شریعت میں انہیں حاصل ہے، بتلائے! ایسا کرنا زکوٰۃ و صلوة کا ماننا ہے یا اس کا انکار کرنا ہے؟ مرزائی بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ختم نبوت کے قائل ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین مانتے ہیں لیکن ختم نبوت اور خاتم النبیین کا خانہ ساز معنی مراد لیتے ہیں، وہ مفہوم نہیں لیتے جو خود صاحب ختم نبوت نے بتلائے ہیں، تو ان

مرزائیوں کو تمام مسلمان ان کے اس دعوے میں جھوٹا تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ ختم نبوت کا وہ اصطلاحی مفہوم نہیں مانتے، بلکہ لغت کی رو سے اس کا خود ساختہ مفہوم مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح اجتہاد کے اصطلاحی مفہوم سے گریز کر کے اس کے لغوی مفہوم کو بنیاد بنا کر یہ کہنا کہ آزاوانہ کوشش کرنے کا نام اجتہاد ہے، نہ اس کے لئے خاص قسم کی اہلیت کی ضرورت ہے نہ خاص اوصاف و شرائط کی۔ جو شخص بھی منتخب ہو کر اسمبلی کے نگار خانے میں پہنچ گیا، اسے ”اجتہاد“ کا حق قانونی طور پر حاصل ہو گیا۔ !!!

یہ وہ بنیادی فکری کجی ہے جس کی وجہ سے اس پر تعمیر ہونے والی عمارت بھی ۔

خشت اول چو نمد معمار کج
تأثرا می رود دیوار کج
کی آئینہ دار ہے۔

بہر حال ”اجتہاد“ کا یہ نظریہ ہر لحاظ سے غلط ہے، جس کی درج ذیل وجوہ ہیں۔

1۔۔۔۔۔ منتخب نمائندگان کی اکثریت اس عملی اہلیت و صلاحیت سے عاری اور ان اوصاف و شرائط سے بے بہرہ ہوتی ہے جو شرعی اجتہاد کے لئے ضروری ہیں۔ ان کی اکثریت قرآن کریم کے سادہ ترجمے تک سے نا آشنا ہوتی ہے چہ جائیکہ وہ اصول تفسیر، علوم قرآن اور احکام قرآنی کی علتوں اور غایتوں کو سمجھ سکیں اسی طرح وہ احادیث رسولؐ سے بھی بے خبر ہوتی ہے۔ اسے اصول حدیث اور اسماء الرجال کی پارکیوں کا کیا پتہ؟ فقہ اسلامی کا ذخیرہ بھی ان کی دسترس سے باہر ہے۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو منتخب افراد قرآن و حدیث کی روشنی میں اجتہاد جیسے نازک اور کٹھن کام سے کس طرح عمدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ جبکہ اجتہاد کے لئے مذکورہ علوم میں مہارت اور مجتہدانہ درک و بصیرت ضروری ہے۔

2۔۔۔۔۔ دوسری خرابی اس سے یہ پیدا ہوگی کہ ہر پانچ سال بعد شریعت کا نیا ایڈیشن تیار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ بات عام تجربہ و مشاہدہ کا حصہ ہے کہ جو بھی نئی حکومت آتی ہے اس کے مفادات و مصالح پچھلی حکومتوں سے مختلف ہوتے ہیں اور وہ اس کی روشنی میں قوانین میں رزو بدل اور ترامیم یا نئی قانون سازی کرتی ہے۔ اگر شریعت کو بھی موم کی ناک بنا کر اس کی تعبیر اور تدوین جدید کا حق اسمبلیوں کے نمائندگان کو دے دیا گیا تو یقیناً.....

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت

کے مطابق شریعت کے ایڈیشن بھی بدلتے رہیں گے اور اس اکھاڑ پچھاڑ میں شریعت کا جو حال ہو گا، محتاج وضاحت نہیں۔ علاوہ ازیں ہر اسلامی ملک میں تعبیر شریعت کا اختیار ماہرین شریعت کے بجائے نمائندگان اسمبلی کو مل گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مصر کی شریعت اسلامیہ اور ہو گی، پاکستان کی اور، ترکی کی اور، سعودی عرب کی اور۔ ہر اسلامی ملک اپنے اپنے حالات اور مصالح کے تحت شریعت کی تعبیر کرے گا، ذرا سوچئے یہ تجویز اپنے اندر کتنے خطرناک مضمرات رکھتی ہے؟

راقم کا خیال ہے کہ علامہ کی اس تجویز کے یہ مضمرات خود ان کو کبھی ناپسند ہیں جس کی تصریح ان کے اشعار اور خیالات میں ملتی ہے۔ مثلاً مشہور اسرار و رموز میں وہ ”راو آیہ“ یعنی اسلاف کی روش پر چلنے کی تاکید کرتے ہیں اور ان کی پیروی کو ضبط ملت کے ہم معنی سمجھتے ہیں نیز زمانہ انحطاط میں ”عالمیان کم نظر“ کے اجتہاد کے مقابلے میں اسلاف کی اقتداء کو محفوظ تر اور اجتہاد کو ملت کے لئے نہایت خطرناک تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

راو آیہ رو کہ میں جمعیت است	معنی	ہلید	ضبط	ملت	است
اجتہاد اندر زبان انحطاط	قوم	را	برہم	ہی	تجید
واجباً عالمیان کم نظر	اقدام	بر	رفناں	محفوظ	تر

اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں۔

مصلحت آہستہ ہوں فرسودہ نیست	کار	پاکاں	از	فرض	آوردہ	نیست
فکر شاہ رسید ہے باریک تر	ذریعہ	شاہ	با	مصطفیٰ	نزدیک	تر
ذوق جعفر و کاوش رازی لمانہ	آمدنے	ملت	تاری	لمانہ		
نگہ ہما رکھنا دین شد است	ہر	لئے	راز	دائر	دین	شد

اس کے بعد پھر اسرار دین سے بیگانہ لوگوں کو اسلاف کے ایک ہی راستے پر مضبوطی سے چلنے اور اختلاف سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں۔

اے کہ از اسرار دین بیگانہ	بایک	آئیں	ساز	اگر	فرزانہ
من شنیدہستم ز نباض حیات	اختلاف	تست	مقراض	حیات	
ازیک آئینی مسلمان زندہ است	یک	ملت	ز	قرآن	زندہ
ماہہ خاک و دل آگاہ اوست	امقراض	کن	کہ	حبل	اللہ
چوں گمر در رشتہ او شد شو	ورنہ	مانند	فہار	آشتہ	شو

□ عناد اور تعصب قوم کے لیے زہر بلائیں کی حیثیت رکھتے ہیں..... لیکن تعصبات سے بالاتر رہ کر
 افہام و تفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

□ علوم جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بجل کا درجہ رکھتے ہیں.....
 لیکن قدیم علوم اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا
 اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

□ غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اقدار کے منافی ہے..... لیکن دین
 اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا
 حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

□ تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالِحِ دینیہ کے خلاف ہے لیکن
 حلال اور حرام کے امتیاز میں رواداری برتنا اور قوانین و مسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی
 روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

□ آئین و سیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے..... لیکن
 ع جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

□ جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اوصاف میں داخل ہے..... لیکن جاہلیت کو مٹانا
 اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔



..... اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

مِلّت

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!
 کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

زر سالانہ: ۲۰۰ روپے

فی شمارہ: ۲۰ روپے